QUARTERLY, PEER REVIEWED
al-amir
ISSN(P): 2790-931X ISSN(E): 2790-9328
E-Mail: editor.alamir@gmail.com

معدوم فقہی مسالک اور عصر حاضر میں ان کے اثرات کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

The Extinct Jurisprudential Schools and Their Impact in the Contemporary Era: A Research and Analytical Study

Dr. Fazail Asrar Ahmed
Associate Prof. (Emeritus) Dept. of Islamic Studies Govt. Allama Iqbal Graduate College Sialkot. Email: fazailkh11@gmail.com
Dr. Hafiz Khurshid Ahmad Qadri
Assistant Professor, Dept. of Islamic Studies, GC University Lahore.
Email: khurshidahmadgcu@gmail.com
Dr. Anwarullah
Lecturer, Dept. of Islamic Studies, University of Okara.
Email: Dr.anwarullah@uo.edu.pk

This article comprehensively studies the extinct Islamic legal schools of thought and their enduring impacts on contemporary jurisprudence. It focuses on the legal methodologies and contributions of notable scholars such as Imam Awza'i, Imam Sufyan al-Thawri, Imam Layth ibn Sa'd, Imam Abu Thawr, the Zahiri school of thought, and Imam Tabari. The article delves into the historical context and various reasons that led to these schools' decline and eventual extinction, including political, social, and doctrinal factors. Despite their disappearance, the article highlights how the principles and rulings of these extinct schools continue to influence the major existing Islamic legal traditions—Hanafi, Maliki, Shafi'i, and Hanbali. An analysis of contemporary jurisprudential practices demonstrates that the ideas and methodologies of these early jurists are still relevant and have been integrated into the modern legal frameworks of Islamic jurisprudence. This study aims to shed light on the significance of these extinct schools, acknowledging their contributions to the rich tapestry of Islamic legal history and their lasting impact on the development and evolution of contemporary Islamic law.

Keywords: Extinct jurisprudential schools, Islamic legal history, Imam Awza'i, contemporary Islamic law, juristic influence.

DOAJ OPEN GLOBAL TRUSTED
Academic Resource Index ResearchBib
Journament
CiteFactor Academic Scientific Journals
اشاریہ اردو جرائد
Electronic Object Identifier
I2OR
Cosmos

تعارف:

پوری اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت اہل سنت کی رہی ہے، اس مکتب فکر میں آج چار فقہی مسالک ہیں لیکن ہماری علمی تاریخ میں ان کے علاوہ اور بھی فقہی مسالک پائے گئے ہیں جو آج ناپید یا معدوم ہو چکے ہیں، ان مسالک کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ کتاب و سنت کا فہم اور حالات و مسائل زمانہ پر ان کی تطبیق گو کہ بہت سے شرعی قواعد کی پابند ہیں، لیکن اس کے باوجود ہماری تاریخ میں فقہی آرا کا ذخیرہ بہت وسیع اور نہایت گوناگوں ہے، اصول و قواعد شریعت نے کتاب و سنت کے فہم اور فقہی آرا کی تشکیل میں راہنمائی تو کی ہے لیکن ان کو کسی تنگنائے میں محدود نہیں کیا ہے۔ چند مسالک کی بقا اور دیگر مسالک کے معدوم ہو جانے کے اسباب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعدد اسباب ہیں، جن کی دریافت، تحلیل و تجزیہ ممکن ہے، صرف حکومتوں کی منشاہی کو اس کا سبب بتانا نہایت غلط ہے، گو کہ حکومتوں کے عروج وزوال کے نتیجہ میں کسی علمی مکتب فکر و گروہ کو مواقع میسر آنا اور دوسرے کے لیے مواقع فراہم نہ ہونا بھی ایک حقیقت ہے لیکن یہی ایک تنہا سبب نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ کی ابتدائی دو صدیوں میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، متعدد ممالک فتح ہوئے، اور صحابہ و تابعین نے وہاں علوم اسلامی کو نہایت فروغ دیا، حجاز، کوفہ، بصرہ، خراسان، شام، مصر و مغرب میں بہت سے علمی مراکز کی داغ بیل پڑی، متعدد علمی و فقہی مکاتب فکر کا آغاز ہوا، اور پورے عالم اسلام کے ہر حصہ میں اسلامی علوم بالخصوص فقہ کا دور دورہ ہوا۔[1] اس تحریر میں ہم جس "معدوم ہونے" کی بات کر رہے ہیں اس سے مراد بس بطور مسلک ختم ہونا ہے، ورنہ ان مسالک، ان کے عالی مقام ائمہ و علما کی آرا آج بھی محفوظ و محترم ہیں، عصر حاضر میں ان سے استفادہ بھی کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ متعدد مسائل میں ان کی آرا کو رائج مسالک کی آرا پر ترجیح بھی دی گئی ہے۔

اہل سنت کے ان معدوم ہو چکے مسالک کی خاصی تعداد ہے، لیکن ہم یہاں صرف ان مسالک کا ہی تذکرہ کریں گے جن کا ذکر امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الحاوی للفتاوی میں کیا ہے، انھوں نے تحریر فرمایا ہے "اس ملت شریفہ میں مسالک کل چار ہی نہیں رہے ہیں، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے طبقات میں مجتہدین بے شمار ہوئے ہیں، جن کے اپنے مسالک تھے، ماضی میں کم از کم دس تو ایسے مسالک تھے جن کے ائمہ کی باقاعدہ تقلید ہوتی تھی اور جن کے مسالک مستقل فقہی کتابوں میں مدون تھے، ان دس میں چار تو مشہور و رائج فقہی مسالک ہیں۔ ان کے علاوہ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ (متوفی: ۱۶۱ھ / ۷۷۸ء)، امام اوزاعی علیہ الرحمۃ (متوفی :157ھ /774ء) مام ابن جریر طبری علیہ الرحمہ (متوفی: ۳۱۰ ھ / 923ء) اور امام داود اصفہانی (متوفی: ۲۷۲ھ / ۸۸۶) کے بھی مستقل فقہی مسالک تھے، جن کے مطابق فتاوی دیے جاتے اور عدالتوں میں فیصلے ہوتے، پھر پانچویں صدی ہجری کے بعد رفتہ رفتہ یہ مسالک ختم ہو گئے، اس لیے کہ ان کے عالی مقام اصحاب افتا و فقہا رخصت ہوتے گئے، اور ان کے شایان شان جانشین نہیں پائے گئے۔"[2]

---

[1] Ibn Khaldun, 'Abd al-Rahman. Al-Muqaddimah (Beirūt: Dār al-Kutub al-Ilm iyyah, 1984 AD), 1/367.

[2] Jalal al-Din al-Suyuṭī, Al-Hāwī lil-Fatawi (Beirūt: Dār al-Kutub al-Ilmiyyah, 1984 AD)1/123.

زیر نظر تحریر میں ہم سیوطی علیہ الرحمۃ کے ذکر کردہ ان چھ مسالک پر ہی گفتگو کریں گے، بس امام اسحاق ابن راہویہ کی جگہ ہم ان کے ہم عصر ایک دوسرے امام، امام ابو ثور ابراہیم بن خالد کلبی بغدادی علیہ الرحمہ (متوفی: ۲۴۰ھ / ۸۵۵ء) کے مسلک کا تذکرہ کریں گے اس لیے کہ ان کا مسلک امام ابن راہویہ کے مسلک سے کہیں زیادہ رائج اور مشہور تھا، اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان مسالک میں متبعین کی تعداد اور اپنی عمروں کے اعتبار سے باہم خاصا فرق ہے۔ ان مسالک پر ہماری گفتگو کے دو حصے ہوں گے، پہلے حصہ میں ہم ان مسالک کا تذکرہ کریں گے، ان کے ائمہ، اُن کی جلالت شان اور ان کے مشہور تلامذہ پر کلام کریں گے، نیز یہ واضح کریں گے کہ ان کی تقلید کسی علاقہ اور زمانہ میں ہوتی تھی، پھر دوسرے حصہ میں ہم ان داخلی و خارجی اسباب پر گفتگو کریں گے جن کی وجہ سے یہ مسالک ناپید ہو گئے اور آخر میں ان کی عصری اطلاقات پر کلام کریں گے۔

امام اوزاعی رحمہ اللہ کا مسلک اور اس کا معدوم ہونا:

امام عبد الرحمان بن عمرو اوزاعی علیہ الرحمۃ عظیم امام فقہ تھے، دمشق میں پیدا ہوئے اور زندگی کا بڑا حصہ وہیں گزارا، وفات بیروت میں پائی۔[3] ان کے علمی مقام کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ امام مالک بن انس رحمہ اللہ (متوفی: ۱۷۹ھ / ۷۹۶ء) نے ایک موقع پر اپنے فتوے کے مقابلے میں ان کے فتوے کو ترجیح دی، اور ارشاد فرمایا: "اوزاعی کی رائے صحیح ہے"۔[4]

امام ابن ابی حاتم (متوفی: 327ھ / 939ء) نے اپنی کتاب الجرح والتعدیل، میں خلفا کے نام امام اوزاعی رحمۃ اللہ کے متعدد خطوط نقل کیے ہیں، جن میں ان کو مسلمانوں کے مصالح کی جانب متوجہ کیا گیا ہے، وہ حکمرانوں کے سامنے بلا خوف و تردد حق کہتے، ابن ابی حاتم نے ہی لکھا ہے کہ

"عباسی عہد کے امیر شام عبد اللہ بن علی عباسی (متوفی: ۱۴۷ھ / 764ء) نے امام اوزاعی علیہ الرحمۃ سے بنو امیہ کو قتل کرنے کا حکم دریافت کیا، آپ نے فرمایا: "ناجائز ہے"۔ اسی امیر شام نے دعوی کیا کہ خلافت بنو ہاشم کا ہی حق ہے تو آپ رحمۃ اللہ تعالی علیہ نے فرمایا: "اگر خلافت رسول اکرم ﷺ کی اولاد کے لیے خاص ہوتی تو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) تحکیم پر راضی نہ ہوتے۔ (یعنی وہ اپنے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلافات میں دو لوگوں کو حکم نہ بناتے کہ وہ جو فیصلہ کر دیں وہ انھیں منظور ہو گا)۔[5]

امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ تعالی علیہ نے ان کی زندگی کے ایک خاص گوشے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے متعدد مواقع پر لبنان کے اہل ذمہ (غیر مسلم آبادی) کو حکمرانوں سے انصاف دلانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا، اسی لیے ان کی وفات پر جب اپنے اس

---

[3] Shams al-Din Abu al-Abbas Ahmad ibn Muhammad ibn Abi Bakr Ibn Khallikan, Wafayat al-A'yan wa-Anba' Abna' al-Zaman (Beirūt: Dār al-Sadar, 1972 AD) 420/2.

[4] Al-Dhahabi, Shams al-Din Muhammad ibn Ahmad, Siyar A'lam al-Nubala' (Beirūt: Mu'assasat al-Risalah, 1985 AD), 8/48.

[5] 'Abd al-Rahman ibn Muhammad Ibn Abi Hātim, Al-Jarh wa-al-Ta'dīl. (Beirūt: Dār al-Kutub al-Ilmiyyah, 1952 AD),2/112.

امام عالی مقام کا جنازہ لے کر مسلمان نکلے تو ایک جانب عیسائیوں کی بڑی تعداد تھی، دوسری طرف یہودی تھے اور تیسری طرف قبطیوں کی ایک جماعت بھی اس جنازہ کے ہم رکاب تھی۔[6]"

حافظ ابن عساکر علیہ الرحمۃ (متوفی: ۱۱۷۶ء/۵۷۱ھ) نے تاریخ دمشق میں لکھا ہے کہ: "امام اوزاعی نے فتوی دینے کا آغاز ۱۱۳ھ / ۷۳۲ء میں کیا، آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، افسوس وہ سب ایک زلزلہ میں تباہ ہو گئیں"۔[7]

امام ذہبی رحمہ اللہ (متوفی: ۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء) امام اوزاعی کے فقہی ورثہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب سیر اعلام النبلاء میں لکھتے ہیں:

"ان کے یہاں بہت سی ایسی بیش بہا فقہی آراپائی جاتی ہیں جو کسی اور کے یہاں نہیں ملتیں، فقہ اسلامی کی عظیم کتابوں میں ان کی یہ آرا موجود ہیں، ان کا ایک مستقل فقہی مسلک تھا، جس پر فقہائے شام و اندلس ایک طویل عرصہ تک کاربند رہے، پھر یہ مسلک ختم ہو گیا۔ امام موصوف کے شاگرد ہقل بن زیاد دمشقی (متوفی: ۱۷۹/796ء) کا یہ قول ابوزرعہ دمشقی نے اپنی تاریخ میں بسند نقل کیا ہے کہ : "امام اوزاعی نے ستر ہزار سے زائد فتاوی دیئے"۔[8]

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک پہلے شام میں رواج پایا، پھر دوسری صدی ہجری کے نصف آخر سے پہلے اندلس پہنچا، امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ الاسلام میں لکھتے ہیں:

"تقریبا ۲۲۰ تک اندلس میں اوزاعی مسلک رائج و غالب رہا، پھر یہ کمزور پڑتا گیا اور اس کی جگہ مالکی مسلک نے لے لی، دمشق میں بھی یہ مسلک ۳۴۰ھ کے آس پاس تک رائج رہا۔ اس مدت میں شام و بیروت میں آپ کا مسلک ہی سکہ رائج الوقت تھا، پھر رفتہ رفتہ یہ وہاں ناپید ہو تا گیا، اور وہاں صرف ان کے جنازے اور بین مذاہب انصاف و تعلقات کے سلسلے میں ان کی خدمات ہی یادگار رہیں۔ اندلس میں یہ مسلک بنی امیہ کے اقتدار (آغاز: ۱۳۸ھ /۷۹۷ء) سے پہلے ہی رائج ہو گیا تھا، اور پھر ہشام رضا کے عہد تک وہاں اس کا دور دورہ رہا، ہشام رضا ۱۷۲ھ / ۷۸۸ء میں حکمران ہوا، اور اپنی وفات (۱۸۰ھ / ۷۹۶ء) تک حکمران رہا"۔[9]

قاضی عیاض مالکی علیہ الرحمہ نے ترتیب المدارک میں تحریر کیا ہے:

"امیر اندلس ہشام بن عبد الرحمان الداخل بن معاویہ نے تمام لوگوں کو مالکی مذہب کی تقلید کا پابند کیا، قضا اور فتوے کے لیے بھی اس مسلک کی پابندی لازمی قرار دی"۔[10]

---

[6] 'Abd al-Rahman ibn Muhammad Ibn Abi Hātim, 2/115.

[7] Ibn 'Asākir, Abu al-Qasim 'Ali ibn al-Hasan, Tārīkh Dimashq (Beirūt: Dār al-Fikr, 1995), 35/365.

[8] Shams al-Din Muhammad ibn Ahmad Al-Dhahabi, Siyar A'lam al-Nubala' (Beirūt: Mu'assasat al-Risalah, 1985), 7/107.

[9] Shams al-Din Muhammad ibn Ahmad Al-Dhahabi, Tārīkh al-Islam wa-Wafayat al-Mashayir wa-al-A'lam (Beirūt: Dār al-Kitab al-ʿArabi, 1987), 8/88.

[10] 'Iyad ibn Musa Al-Qadi 'Iyad, Tartib al-Madarik wa-Taqrib al-Masalik li-Ma'rifat A'lam Madhhab Malik (Morocco: Ministry of Endowments and Islamic Affairs, 1983),1/149.

امام اوزاعی رحمہ اللہ کے شاگرد صعصعہ بن سلام (متوفی: ۱۹۲ھ / ۸۰۸ء) اس مسلک کو لے کر اندلس پہنچے تھے۔ جب کہ شام میں اوزاعی مسلک نسبتاً طویل مدت تک یعنی چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر تک رہا، امام ابن تیمیہ نے مجموع الفتاوی میں لکھا ہے کہ: "امام اوزاعی امام اہل شام تھے، چوتھی صدی ہجری تک اہل شام ان کے ہی مسلک پر رہے۔ وہاں اس مسلک کے آخری فقیہ قاضی احمد بن سلیمان بن حذلم (متوفی: ۳۴۷ / ۹۵۹ء) تھے، ابن عساکر اللہ نے ان کے سلسلے میں لکھا ہے: وہ آخری ایسے فقیہ تھے جو جامع دمشق میں اپنے حلقہ میں اوزاعی مسلک پڑھایا کرتے تھے"۔[11]

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کا مسلک اور اس کا معدوم ہونا:

امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جلیل القدر محدث اور عظیم کوفی فقیہ تھے، امام سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۹۸ھ / ۸۱۴ء) نے ان کے بارے میں کہا تھا: میں نے سفیان ثوری سے زیادہ وسیع العلم فقیہ نہیں دیکھا"۔[12] امام عجلی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء) نے اپنی کتاب الثقات میں لکھا ہے "وہ عظیم محدث اور متبع سنت فقیہ تھے، حکمران وقت کے سامنے حق گوئی میں امتیازی شان رکھتے تھے"۔[13] عباسی خلیفہ منصور (متوفی: ۷۷۵ / ۱۵۸ء) نے امام ثوری کو قاضی بنانا چاہا، لیکن آپ نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا، اس منصب سے بچنے کے لیے ۱۵۵ھ / ۷۷۲ء کے اواخر میں آپ نے کوفہ کو خیر باد کہا، اور حکومت کی نظروں سے اوجھل رہتے ہوئے بقیہ عمر عراق و حجاز کے مختلف شہروں میں گزار دی، اور اسی حال میں بصرہ میں وفات پائی، ندیم (۳۸۴ھ / ۱۰۴۷ء) نے اپنی کتاب الفہرست میں امام ثوری کی مختلف کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں لکھا ہے کہ: "انھوں نے اپنی موت کے بعد اپنی کتابیں نذر آتش کیے جانے کی وصیت کی تھی۔"

امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کا آغاز کوفہ سے ہوا تھا، پھر یہ مسلک وہاں سے دارالسلطنت بغداد پہنچ گیا، جہاں ان کے شاگرد عبید اللہ بن عبد الرحمان اشجعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۸۲ھ / ۷۹۹ء) قیام پذیر تھے، خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۴۶۳ھ ۱۰۷۲ء) نے تاریخ بغداد میں ذکر کیا ہے کہ": امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے ان کے حلقہ درس کی ذمہ داری عبید اللہ اشجعی رحمۃ اللہ علیہ کو دینی چاہی، لیکن انھوں نے معذرت کر لی"۔[14] اپنی کتاب" الباعث الحثیث "میں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۲/774ء) نے لکھا ہے کہ ":امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کئی صدیوں تک پانچ متبوعہ مسالک میں سے ایک کے امام کے طور پر جانے جاتے رہے۔ لیکن پانچویں

---

[11] Ahmad ibn 'Abd al-Halim Ibn Taymiyyah, Majmu' al-Fatawa (Madinah: King Fahd Complex for the Printing of the Holy Qur'an, 1995), 3/150.

[12] Ahmad ibn 'Ali Ibn Hajar al-'Asqalani, Tahdhib al-Tahdhib (Beirūt: Dār al-Fikr, 1984 AD), 4/110.

[13] Ahmad ibn 'Abd Allah Al-'Ajli, Al-Thiqāt (Beirūt: Dār al-Kutub al-Ilmiyyah, 1985 AD), 1/192.

[14] Ahmad ibn 'Ali Al-Khatib al-Baghdadi, Tārīkh-e-Baghdad (Beirūt: Dār al-Kutub al-Ilmiyyah, 1997 AD), 9/151.

صدی ہجری کے آغاز میں ان کا مسلک بغداد میں باقی نہیں بچا"۔[15] ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب المنتظم میں لکھا ہے کہ: عبد الغفار بن عبد الرحمان دینوری رحمہ اللہ (متوفی ۵۴۰۵ / ۱۰۱۵ء) بغداد میں امام ثوری کے مسلک پر فتوی دینے والے آخری فرد تھے"۔ امام ثوری علیہ الرحمۃ کے شاگرد رشید نعمان بن عبد السلام بکری (متوفی: 183 ھ / ۸۰۰ء) نہایت ممتاز عابد و زاہد اور عظیم الشان محدث وفقیہ تھے، ان کے ذریعہ یہ مسلک اصفہان پہنچا، شیراز و جرجان (یہ دونوں خطے آج ایران میں واقع ہیں) میں بھی یہ مسلک رائج رہا۔ خراسان، بالخصوص اس کے صدر مقام نیساپور اور دینور (جو آج شمال مغربی ایران میں واقع ہے) میں بھی اس مسلک کے متبعین تھے۔ امام اوزاعی کی طرح ان کا مسلک بھی شام میں فروغ پایا، اس لیے کہ وہاں بھی امام ثوری کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد تھی، جو اپنے وقت کے آئمہ بنی، ان میں عظیم ترین صوفی بشر الحافی (متوفی: ۲۲۷ھ / ۸۴۲ء) اور معافی بن عمران الازدی (متوفی: ۶۸۰۱ / ۱۸۴) نہایت جلیل القدر تھے۔[16]

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ (۳۵۴ھ / ۹۶۵ء) نے الثقات میں بتایا ہے کہ: مؤخر الذکر کو امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ "یاقوتہ" (گوہر نایاب) کہتے تھے۔ ابن عساکر کے بقول شام میں اس مسلک کے ممتاز فقہاء میں ایک نام قاضی حافظ مکی بن جابار دینوری (متوفی: ۱۰۷۶ / ۴۶۸) کا بھی تھا۔ اس مسلک کے متبعین کئی صدیوں تک پائے جاتے رہے، شمس الدین غربی علیہ الرحمۃ (متوفی: ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء) نے اپنی کتاب دیوان الاسلام میں لکھا ہے کہ: اس مسلک کے مقلدین تقریبا ۵۰۰ھ تک پائے گئے۔ لیکن غالبا یہ مسلک اس کے بعد بھی خاصے زمانے تک پایا جاتا رہا، اس لیے کہ محدث عبد الرحمان بن حمد صوفی دونی عراقی علیہ الرحمۃ (متوفی: ۵۰۱ / ۱۱۰۶ء) کو ابو طاہر سلفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب معجم السفر، میں اس مسلک کا پیرو بتایا ہے،[17] بلکہ ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ میں بھی خراسان میں اس مسلک کے مقلدین پائے جانے کی بات لکھی ہے۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مسلک کے خاتمہ میں اس کے حاملین کے زاہدانہ رجحانات کا بڑا کردار ہے، گو کہ اس کا ایک اور سبب حکومت وقت کا داروگیر کا رویہ بھی ہے، جس کے نتیجہ میں اس مسلک کے طلبہ کی تعداد کم ہوتی گئی، اس کا فقہی ذخیرہ محفوظ و مدون نہیں ہو سکا، اور اس کی فقہی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔

امام لیث بن سعد رحمہ اللہ کا مسلک اور اس کا معدوم ہونا:

امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ تعالی علیہ (متوفی: ۱۷۵ھ / ۷۹۲ء) معروف امام، احادیث و آثار کے بڑے حافظ اور نہایت بلند علمی مقام کے حامل تھے، ان کے مقام بلند کا اندازہ امام مالک کے شاگرد عبد اللہ بن وہب علیہ الرحمۃ (متوفی: ۱۹۷ھ / ۸۱۳ء) کے اس جملہ سے ہوتا ہے: امام مالک اپنی کتابوں میں جہاں بھی یہ جملہ تحریر فرماتے ہیں کہ: "مجھے میرے پسندیدہ عالم نے بتایا، تو اس سے ان کی مراد لیث بن

---

[15] Isma'il ibn 'Umar Ibn Kathir, Al-Ba'ith al-Hathith Sharh Ikhtisar 'Ulum al-Hadith (Cairo: Maktabat Dār al-Tūrāth, 1966 AD), 58.

[16] Ahmad ibn 'Ali Al-Khatib al-Baghdadi, Tārīkh-e-Baghdad, 13/296.

[17] Abu Tahir al-Salafi, Mu'jam al-Safar (Beirūt: Dār al-Kutub al-Ilmiyyah, 2000), 2/135.

سعد رحمہ اللہ ہی ہوتے ہیں"۔[18] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۲۰۴ھ / ۸۲۰ء) فرماتے ہیں: "امام لیث علیہ الرحمہ مالک بن انس سے بڑے فقیہ تھے، لیکن ان کے شاگردوں نے انھیں ضائع کر دیا"۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ابو شیخ اصفہانی (متوفی: ۳۶۹ھ / ۹۷۷ء) نے طبقات المحدثین باصفھان، میں نقل کیا ہے۔[19] امام موصوف کثیر التصانیف تھے، جیسا کہ امام ذہبی نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے، لیکن، یہ تمام تصنیفات معدوم ہو گئیں، صرف ان کا ایک رسالہ ابن مندہ (متوفی: ۴۷۵ھ / ۱۰۸۲ء) کی "الفوائد" کے ساتھ شائع ہوتا ہے، اسی طرح ان کے امالی کا ایک مختصر مجموعہ مجلس من فوائد اللیث بن سعد کے نام سے شائع ہوتا ہے، ان کے شاگردوں میں ان کے صاحبزادے شعیب (متوفی: ۱۹۹ھ / ۸۱۵ء) اور ان کے پوتے محدث وفقیہ عبد الملک بن شعیب (متوفی: ۲۴۸ھ / ۸۶۳ء) تھے، صاحبزادہ گرامی شعیب کے بارے میں ابن یونس صدفی (متوفی: ھ۳۴۷/ ۹۵۹ء) نے لکھا ہے کہ وہ محدث، فقیہ و مفتی تھے۔ اسی طرح ان کے ممتاز شاگردوں میں یہ نام بھی شامل تھے: عبد اللہ بن صالح الجہنی (۲۲۲ھ / ۸۳۸ء)، حماد بن صفوان بن عتاب غافقی (جن کے بارے میں سمعانی نے لکھا ہے کہ وہ امام لیث بن سعد علیہ الرحمۃ کے حاضر باش اوران کے مسلک کے حافظ تھے)، اسحاق بن بکر بن مضر، تاریخ ابن یونس میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ امام لیث کے حلقہ میں فتوے دیا کرتے تھے۔ امام لیث کا مسلک ناپید ہو گیا، گو کہ علمی وفقہی کتابوں میں ان کی علمی و سماجی زندگی کے آثار و نقوش محفوظ رہے۔

امام ابو ثور علیہ الرحمۃ کا مسلک اور اس کا معدوم ہونا:

امام ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: 240ھ / 855ء) کا نام ابراہیم بن خالد کلبی علیہ الرحمۃ تھا، خطیب بغدادی نے ان کو نہایت ثقہ محدث اور عظیم امام بتایا ہے، احکام سے متعلق آپ کی متعدد تصنیفات ہیں جو حدیث وفقہ کی جامع ہیں، امام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ (متوفی: ۲۴۱ھ / ۸۵۶ء) نے ان کی بابت بڑے بلند کلمات ارشاد فرمائے ہیں، ایک موقع پر امام احمد سے کسی نے کوئی فقہی مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: اللہ تمھیں اچھا رکھے، کسی اور سے پوچھ لو، فقہا سے پوچھو، ابو ثور سے دریافت کرلو۔ امام موصوف پہلے حنفی مسلک کے متبع تھے، پھر امام شافعی جب عراق تشریف لائے تو ان سے کسب فیض کیا۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں: وہ پہلے اہل الرائے کی فقہ پر عمل پیرا تھے، اور اہل عراق (احناف) کی آراء پر فتوے دیتے تھے، پھر امام شافعی بغداد تشریف لائے تو وہ اہل الرائے کا حلقہ چھوڑ کر محدثین کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ لیکن جلد ہی ان کا ایک مستقل مسلک ہو گیا۔[20] ابن ندیم نے لکھا ہے: انھوں نے ایک نیا مسلک تشکیل دیا، جو امام شافعی کی مختلف آراء سے مستفاد اور ان کے منتخب اقوال پر مشتمل تھا۔ (امام شافعی اپنی آخر عمر میں مصر میں مقیم رہے، مصر جانے کے بعد ان کی بہت سی آراء تبدیل ہوئیں، مصر سے پہلے کی ان کی آراء کو ان کا "مسلک قدیم" اور مصر کے زمانہ قیام کی ان کی آراء کو ان کا

---

[18] Yusuf ibn 'Abd Allah Ibn 'Abd al-Barr, Al-Intiqa' fi Fada'il al-Thalathat al-Fuqaha' (Beirūt: Dār al-Kutub al-Ilmiyyah, 1997), 121.

[19] 'Abd Allah ibn Muhammad Abu al-Shaykh al-Asfahani, Tabaqat al-Muhaddithīn bi-Asbahan (Beirūt: Dār al-Kutub al-Ilmiyyah, 1992), 2/148.

[20] Ahmad ibn 'Ali Al-Khatib al-Baghdadi, Tārīkh-e-Baghdad, 6/66

"مسلک جدید" کہا جاتا ہے، درج بالا عبارت میں ندیم کی بات کا حاصل یہی ہے کہ امام ابو ثور نے اپنے نو تشکیل مسلک میں امام شافعی کی قدیم وجدید آراسے منتخب آراء جمع کی تھیں)۔

حافظ ابن عبد البر اندلسی (متوفی: ۱۰۷۱/۴۶۳ء) نے الانتقاء في فضائل الثلاثة الآئمة الفقهاء " میں لکھا ہے کہ: امام ابو ثور نے متعدد تصانیف سپرد قرطاس کیں، جن میں وہ مختلف آراء ذکر کر کے اپنے نزدیک راجح رائے کے دلائل ذکر کرتے ہیں، معروف فقہا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ابن عبد البر علیہ الرحمۃ آگے لکھتے ہیں:

"اپنی تمام تصنیفات میں ان کا رجحان بالعموم امام شافعی کی آراء کی جانب ہوتا ہے۔ مسلک شافعی سے اسی قربت کی وجہ سے امام ابو ثور کے مسلک میں کہیں حنفیت، کہیں شافعیت اور کہیں ایک مستقل مسلک کا رنگ نظر آتا ہے، اسی وجہ سے امام نووی اللہ (متوفی: ۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء) کو تہذیب الاسماء واللغات میں اس وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی کہ: گو کہ ہم نے امام ابو ثور رحمہ اللہ کا شمار امام شافعی کے شاگردوں، آپ سے کسب فیض کرنے والوں اور آپ کی کتابوں و اقوال و آراء کو نقل کرنے والوں میں کیا ہے لیکن یہ حقیقت ذہن میں رہے کہ وہ ایک مستقل مسلک کے بانی ہیں، لہذا ان کی رائے کو مسلک شافعی کا ایک قول نہ سمجھا جائے۔ امام نووی نے مزید لکھا ہے کہ: علما کی مختلف آراء جمع کرنے والے مصنفین کی یہی رائے ہے، امام نووی نے بہت سے مسائل میں امام ابو ثور کے مسلک کو امام شافعی کے مسلک سے باعتبار دلیل زیادہ مضبوط و قوی قرار دیا ہے۔[21]

آپ کے عظیم تلامذہ میں یہ شخصیات بھی شامل ہیں: عبید اللہ بن محمد بن خلف بزار علیہ الرحمۃ (متوفی: ۹۰۶/۲۹۳ء)، امام جوزی نے ان کو "المنتظم" میں فقہ ابو ثور کا حامل لکھا ہے، عظیم صوفی حضرت جنید بن محمد بغدادی (متوفی 298/۲۹۸ء) جو فقہ، تصوف اور حدیث کے بیک وقت امام تھے، اور جن کا خود کا بیان ہے کہ: میں بیس برس کی عمر میں ہی ابو ثور کے حلقہ درس میں فتوی دینے لگا تھا، حسن بن سفیان شیبانی نسائی (متوفی: 303ھ /910ء) ابن عساکر نے انھیں عظیم ادیب وفقیہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ: انھوں نے ادب کی تعلیم نضر بن شمیل (متوفی: ۲۰۴ھ / ۸۲۰ء) سے حاصل کی، اور فقہ میں براہ راست ابو ثور سے کسب فیض کیا۔ چونکہ امام ابو ثور کے یہاں امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے اقوال کا منتخب مجموعہ ملتا ہے اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا مسلک دو مختلف فقہی مناہج (اہل رائی واہل روایت کے مناہج) کے باہم ملنے کا نتیجہ ہے۔ افسوس کہ ان کا مسلک زیادہ عرصہ رائج نہیں رہ سکا۔

سیر اعلام النبلاء میں امام ذہبی نے لکھا ہے کہ: 300ھ کے بعد امام ابو ثور کے متبعین ناپید ہو گئے، جغرافیائی طور پر دیکھیں تو ان کا مسلک ان کے وطن سے باہر ایک محدود علاقے میں پھیلا، اس لیے کہ ندیم نے ان کے فقہی ورثہ کی تصنیفات کے عناوین درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: " آذربائیجان اور ارمینیہ کے اکثر لوگ ان کے مسلک کے مقلد تھے۔[22]

---

[21] Yahya ibn Sharaf Al-Nawawi, Tahdhib al-Asma' wa-al-Lughat (Beirūt: Dār al-Kutub al-Ilmiyyah, 1993), 1/145.

[22] Shams al-Din Muhammad ibn Ahmad Al-Dhahabi, Siyar A'lam al-Nubala' (Beirūt: Mu'assasat al-Risalah, 1985), 12/597.

ظاہری مسلک اور اس کا معدوم ہونا:

اس مسلک کے بانی امام داؤد بن علی اصفہانی (متوفی: ۲۷۰ھ /884) تھے، اس مسلک کے حاملین نصوص کے ظاہر پر تمسک کے قائل ہیں، اور احکام شریعت کے اصولوں میں قیاس کو داخل کرنے کے سخت خلاف ہیں، خطیب بغدادی نے امام داؤد اصفہانی کو اس رجحان کا پہلا داعی کہا ہے۔[23] اسی رجحان کی وجہ سے یہ مسلک دیگر مسالک کے مقابلے ایک بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے، اسی سبب نے دیگر مسالک اور عام فقہی رجحان سے اس مسلک کا علمی رابطہ منقطع کر دیا، اور مسلک کی علمی ساخت کو پیچیدہ بنا دیا۔

سیر اعلام النبلاء میں ذہبی نے داؤد اصفہانی کے بارے میں لکھا ہے: امام، بحر العلوم، حافظ حدیث، علامہ زماں..... پیشوائے اہلِ ظاہر... امام اسحاق بن راہویہ اور امام ابو ثور سے تحصیل علم کی، کہا جاتا ہے کہ ان کے حلقہ درس میں چار سو شاگرد شرکت کرتے..... اپنے وقت میں بغداد کے سب سے بڑے عالم و امام تھے۔ امام داود نے فقہی ابواب پر منقسم متعدد کتابیں تصنیف کیں، اپنے پیچھے جلیل القدر شاگرد چھوڑے، جن میں سب سے نمایاں نام ان کے صاحبزادے امام ابو بکر محمد بن داود (متوفی: ۲۹۷ھ / ۹۱۰ء) کا تھا، انھوں نے ایک کتاب الانتصار من ابی جعفر، تصنیف کی، ابو جعفر امام داؤد کی کنیت تھی، اس کتاب میں انھوں نے اپنے والد ماجد کی آراء پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا۔ امام داؤد کے ایک شاگرد عبد اللہ بن مغلس ظاہری (متوفی: ۳۲۴ھ / ۹۳۷ء) بھی تھے، امام خطیب بغدادی کے بقول: مختلف علاقوں میں امام داؤد کا مسلک ان ہی کے ذریعہ پھیلا۔ عالم اسلام کے مشرقی حصہ میں تو اس مسلک کے متبعین پائے جاتے تھے، لیکن مغرب میں اس کو اس وقت فروغ حاصل ہوا جب اندلس میں اس کو عروج ملا، اس مسلک کو اندلس پہنچانے والی پہلی شخصیت عبد اللہ بن قاسم القیسی (متوفی: ۲۷۲ھ / ۸۸۶ء) کی تھی، جن کے سلسلے میں ابن حزم (متوفی: ۴۵۶ھ / ۱۰۶۴ء) نے اپنے رسالہ "رسالۃ فی فضل الاندلس" میں لکھا ہے کہ: جب ہم عبد اللہ بن قاسم اور منذر بن سعید بلوطی (متوفی: ۳۵۵ھ / ۹۶۶ء) کا تذکرہ کرتے ہیں تو پھر ان کا ہم سر صرف ابو الحسن بن مغلس [اور ان جیسے معدود چند علما] کو ہی پاتے ہیں، ان لوگوں کو عبد اللہ بن قاسم کی مانند امام داؤد ظاہری کی صحبت اور ان سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔[24]

اندلس میں اس مسلک کی ممتاز شخصیت قاضی القضاۃ منذر البلوطی تھے، جنھوں نے اپنی بعض دستیاب کتابوں میں اندلس کے مالکی ماحول میں اپنے مسلک کا دفاع کیا، فقہ میں اپنے ظاہری رجحان کے باوجود عقائد میں وہ متکلمین کی آراء کی جانب میلان رکھتے تھے۔ ابو الحسن نباہی (متوفی: ۷۹۰ھ / ۱۳۹۲ء) نی المرقبۃ العلیاء میں ان کی بابت لکھا ہے: وہ مختلف علوم میں درک رکھتے تھے، فقہ میں امام داؤد ظاہری کے رجحان کے حامل تھے، ان کے مسلک کو ہی بالعموم ترجیح دیتے، ان کی کتابیں جمع کرتے، ان کے اقوال سے استدلال کرتے، اور ان پر عمل کرتے، لیکن جب مجلس قضا میں ہوتے تو اپنے علاقے کے رائج مسلک مالکی مسلک سے عدول نہ کرتے اس کے مطابق فیصلے کرتے۔

---

[23] Ahmad ibn 'Ali Al-Khatib al-Baghdadi, Tārīkh-e-Baghdad, 8/347.

[24] 'Ali ibn Ahmad Ibn Hazm, Risalah fi Fadl al-Andalus (Beirūt: Dār al-Afāq al-Jadidah, 1983), 57.

مغرب واندلس میں موحدین کے عہد حکومت کے کچھ عرصہ میں ظاہری مسلک کا عروج رہا، بالخصوص منصور یعقوب موحدی (متوفی 595ھ / 1199ء) کے زمانے میں، جس کے سلسلے میں مقری نے نفح الطیب، میں لکھا ہے کہ: وہ ابن حزم کا بہت قائل تھا، (ابن حزم سے اس کی عقیدت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ) ایک دن وہ ان کی قبر پر کھڑا ہوا تھا، تھوڑی دیر کے بعد بولا: تمام علما ابن حزم کے محتاج ہیں۔[25] غالباً اسی فرط عقیدت کا نتیجہ تھا کہ جب مملکت میں نفوذ رکھنے والے بعض مالکی فقہانے اندلس کے حکمرانوں سے ظاہری مسلک کے خلاف اقدامات اور ابن حزم کی کتابوں کو نذر آتش کرنے کی خواہش کی، تو اس نے ۵۹۱ / ۱۱۹۵ء میں فقہ مالکی کی کتابوں کو اندلس اور مغرب میں نذر آتش کرنے کا حکم دیا، مؤرخ عبد الواحد مراکشی (متوفی: ۶۴۷ ۱۲۵۰ء) نے اپنی کتاب المعجب، میں اس سلسلے کے واقعات درج کیے ہیں۔ ظاہریہ کا یہ مسلک اگرچہ زیادہ عام ورائج نہ ہو سکا لیکن پھر بھی ایک طویل زمانہ تک رہا، یہاں تک کہ ابن تیمیہ نے آٹھویں صدی ہجری کے نصف میں لکھا کہ: ان کا مسلک ابھی بھی باقی ہے۔ پھر ذہبی نے بھی سیر اعلام النبلاء میں اس مسلک کے اپنے زمانے میں وجود کی خبر دی: آج دنیا میں پانچ مسالک ہیں، جن میں سے پانچواں داؤدیوں کا (امام داؤد کے متبعین کا ظاہری مسلک) ہے، لیکن وہ ساتھ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی تعداد اب بہت کم ہے۔" ابن خلدون (متوفی: ۸۰۸ھ / ۱۴۰۶ء) نے اس صدی کے آخر میں ظاہریہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: پھر اہل ظاہر کا مسلک اپنے آئمہ کے رخصت ہو جانے سے ختم ہو گیا۔[26]

امام ابن جریر طبری علیہ الرحمۃ کا مسلک:

امام محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ زمانی اعتبار سے وہ آخری امام تھے جنہوں نے ایک مستقل مسلک کی داغ بیل ڈالی، اپنے فقہی ورثہ کو انھوں نے اپنی غیر مکمل کتاب تہذیب الآثار میں درج کیا تھا، جس کو خطیب بغدادی نے اپنے صبح کی بے نظیر کتاب قرار دیا ہے۔ فتنہ خلق قرآن (۲۱۸-۲۳۲ھ / ۸۳۳-۸۴۷ء) نے بغداد کی صورت حال تبدیل کر کے رکھ دی تھی، اب بغداد بدل چکا تھا، امام طبری اور ظاہریہ کے درمیان پائے جانے والے اختلافات نے انھیں ایک اور طرح کی آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا، امام داؤد ظاہری کے صاحبزادے ابو بکر محمد بن داؤد ظاہری نے ان پر بعض صفات الہیہ کی تاویل کی تہمت لگائی، عوام کے درمیان یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ طبری پاؤں پر مسح کو جائز قرار دیتے ہیں، جس کی وجہ سے عوام ان پر شیعیت کی تہمت لگانے لگے۔ امام طبری کی کتابوں میں کہیں بھی صفات میں تاویل نہیں پائی جاتی، بلکہ اس کے برعکس امام ذہبی کہتے ہیں: امام موصوف کی تفسیر صفات کی آیات میں سلف کے ایسے اقوال سے بھری ہوئی ہے جن میں صفات کی نفی یا تاویل نہیں ان کا اثبات کیا گیا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ صفات مخلوق کی صفات جیسی نہیں ہیں۔ امام ذہبی علیہ الرحمۃ مزید لکھتے ہیں: ان پر قدرے تشیع کا الزام لگایا گیا، لیکن ہمیں تو ان کے یہاں صرف خیر ہی ملتا ہے،

[25] Ahmad ibn Muhammad Al-Maqrizi, Nafh al-Ṭīb min Ghusan al-Andalus al-Ratīb (Beirūt: Dār Sader, 1968), 244/5.

[26] 'Abd al-Rahman ibn Muhammad Ibn Khaldun, Al-Muqaddimah (Beirūt: Dār al-Fikr, 1988), 458.

بعض حضرات ان کی جانب پیر پر مسح کیے جانے کا قول منسوب کرتے ہیں لیکن ان کی کتابوں میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ افواہوں اور بدگمانیوں کی اسی فضا میں حنابلہ نے لوگوں کو طبری کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے احادیث سننے سے روکا، جس پر بقول خطیب بغدادی علیہ الرحمۃ عظیم محدث ابن خزیمہ علیہ الرحمۃ (متوفی: ۳۱۱/ ۹۲۴ء) نے ان پر تنقید کی اور کہا: اس روئے زمین پر میں نے محمد بن جریر (طبری) سے بڑا عالم: نہیں دیکھا لیکن حنابلہ نے ان پر ظلم کیا۔ امام طبری کے بہت سے شاگردوں کا تذکرہ ندیم نے کیا ہے، مثلاً: "المدخل الی مذھب الطبری،" اور "الاجماع في الفقہ علی مذھب ابي جعفر"، کے مصنف احمد بن یحیی متکلم (متوفی: ۳۲۷ھ ۹۳۹ء)، اس مسلک کے عظیم نمائندے، معروف قاضی، صوفی وادیب معافی بن زکریا نہروانی جریری (متوفی: ۳۹۰ھ / ۱۰۰۰ء) جو علم کلام سے لے کر علم نحو تک متعدد علوم کے ماہر تھے، اور ندیم کے بقول ان کی تصنیفات کی تعداد پچاس سے متجاوز ہے، جن میں شرح کتاب الخفیف للطبری اور الجلیس الصالح شامل ہیں، مؤخر الذکر ان کی مشہور ترین کتاب ہے۔ امام طبری کا مسلک کن کن خطوں و علاقوں میں رواج پایا یہ تو ہم حتمی طور پر نہیں بتاسکتے، لیکن مؤرخ تاج الدین بن ساعی (متوفی: ۶۷۴ھ ۱۲۷۳ء) نے اس مسلک کے قابل لحاظ حد تک پھیلنے کی بات کہی ہے، ساعی الدر الثمین في اسماء المصنفین میں لکھتے ہیں: امام طبری کا فقہ میں ایک مستقل مسلک تھا، ان کا شمار ممتاز ترین آئمہ میں ہوتا ہے، ان کے علم کو بہت فروغ ملا۔ امام طبری کا مسلک ان کی وفات کے بعد زیادہ عرصہ نہیں چلا،

امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں لکھا ہے کہ ان کا مسلک چوتھی صدی ہجری کے بعد تک رہا۔ اس طرح مسلکی تعصب نے مسالک اربعہ کے علاوہ پائے جانے والے آخری مسلک کو فروغ نہ پانے دیا، اسے معدوم کر دیا اور امت ایک ممتاز اصولی و فقہی مکتب فکر سے محروم ہو گئی۔"

فقہی مسلک کے لازمی عناصر:

کسی بھی فقہ کے مسلک بننے کے لیے کچھ لازمی عناصر درکار ہوتے ہیں، مثلاً ساخت کے اعتبار سے ایک امام اور ان کے تلامذہ علمی طور پر مسلک کے ایسے مبادی اور منہج کا وجود جن پر مسلک کی بنیاد ہو: امام کی جانب منسوب روایات اور اصولوں کی ان کی جانب نسبت کا مستند و قابل اطمینان ہونا، امام کے فقہی قواعد کا استخراج اور ان کی ترتیب، ایسی کتابیں جن میں ان قواعد کو جمع کر کے ان پر فروع کی بنیاد رکھی جائے، تخریج مسائل اور تدریس کے لیے مناسب طریقہ ہائے کار کی تشکیل، ترجیح کے اصولوں اور مسلک کے مطابق فتاوی دینے کے طریقوں کی تعیین، ان سب امور سے ایک مسلک کی اپنی مستقل ساخت اور اس کی وہ اصولی صورت تشکیل پاتی ہے جس کی روشنی میں مختلف علاقوں میں اس کے مختلف مکاتب وجود میں آتے ہیں۔ امام زرکشی (۷۹۴ھ / ۱۳۹۲ء) نے ان مسالک کے جن کی منہجی خدمت نہیں ہو سکی ہے مقبول نہ ہونے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: ان آئمہ کی ہی تقلید ممکن ہوتی ہے جن کے مسالک مدون اور اس قدر عام ہوتے ہیں کہ ان کے مطلق کی قید اور عام کی تخصیص معروف ہو، اس کے برخلاف جن آئمہ کے فتاوی مدون نہیں ہوتے، بلکہ یوں ہی منقول ہوتے ہیں تو ان کی تقلید ممکن نہیں ہوتی، اس لیے کہ ان فتاوی کی بابت یہ شک رہتا ہے کہ کہیں کوئی دوسرا فتوی ایسا نہ ہو جو اس فتوے کے لیے تکملہ، قید یا تخصیص کی حیثیت رکھتا ہو، یعنی ایسے حضرات کی تقلید سے اصل مانع یہ ہے کہ ان کے مسلک کی حقیقت کا علم

ناممکن ہو جاتا ہے۔ المستدرک علی مجموع فتاوی ابن تیمیۃ، میں امام ابو عمرو ابن صلاح شافعی (متوفی: ۱۲۴۶/ ۵۶۴۳ء) کی یہ رائے درج کی گئی ہے کہ: صحابہ اگرچہ دوسروں سے زیادہ علم رکھتے تھے لیکن مقلد کے لیے کسی صحابی کے مسلک کی تقلید جائز نہیں ہے، اس لیے کہ انھوں نے اپنا علم مدون اور اصول و فروع مرتب و منضبط نہیں کیے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی کا مسلک وجود میں نہیں آسکا، یہ کام بعد کے علما نے کیا ہے۔ ان لازمی عناصر میں سے کسی عنصر کے نہ پائے جانے کی وجہ سے بعض فقہی مسالک ترقی نہیں کر سکے اور جاری نہیں رہ سکے۔

زہد اور عزلت پسندی:

اس موقع پر ہم نفسیاتی کیفیات اور مسلک کی تدوین نیز اگلی نسلوں تک مسلک کے پہنچنے پر ان کے اثر انداز ہونے سے صرف نظر نہیں کر سکتے ہیں، بعض ائمہ نے اپنی تصنیفات اور اپنے علم کو وہ حیثیت نہ دی جس کے وہ مستحق تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ورثہ ضائع ہو گیا، مثلاً امام اوزاعی ان کی تصنیفات نذر آتش ہو گئیں تو انھوں نے اس کے بعد اپنی تصنیفات پر توجہ ہی نہیں دی، ابن عساکر نے بیان کیا ہے کہ :زلزلہ میں امام اوزاعی کی کتابیں جل کر راکھ ہو گئیں، یہ تیرہ بڑے رجسٹروں میں تحریر تھیں، ایک شخص ان کی تصنیفات کے نسخے لے کر حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ یہ آپ کی تصنیفات کی نقل ہے، ان کی اصلاح اپنے ہاتھ سے فرما دیجیے، لیکن امام اوزاعی نے اپنی زندگی میں اپنی تصنیفات کے ان نسخوں پر توجہ ہی نہیں دی۔ جس زلزلہ کا یہاں پر ذکر ہے وہ ۱۳۰ھ / ۷۴۸ء میں شام کے ساحلی علاقوں میں آیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام اوزاعی پر زندگی کے ایک مرحلہ میں زہد کا غلبہ ہو گیا تھا، اس وقت وہ شام کے ایک سرحدی علاقہ میں بطور مرابط (سرحدی محافظ) تعینات رہے، ابن عساکر نے ان کے شاگرد ولید بن مزید بیروتی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: میں نے امام اوزاعی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں سرحد کی پہرہ داری (رباط) کے لیے بیروت آیا۔ پھر جب زہد کی یہ کیفیت جاتی رہی تو انھوں نے اپنی کتابوں کی روایت کی اجازت دے دی، ابن عساکر نے ہی ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ولید بن مزید کے پاس میری کتابوں کے جو نسخے ہیں وہ صحیح ہیں، ان سے استفادہ کرو۔ ابن مزید کی ولادت ۱۲۶ھ / ۷۴۴ء کی ہے اس لیے ان کو امام اوزاعی سے تلمذ کا شرف زلزلہ کے بعد ہی ملا ہو گا۔ اس لیے یہ بات کہنی صحیح ہے کہ زہد کی مذکورہ بالا کیفیت رخصت ہونے کے بعد امام موصوف پھر تعلیم و تدریس کی جانب متوجہ ہوئے ہوں گے۔ جب آئمہ پر ایسی کیفیات کا غلبہ ہو تو ان کے تلامذہ بدرجہ اولی اس سے دوچار ہوں گے، اور ان کی ایک تعداد بھی عزلت پسندی اور اپنی ذات تک محدود رہنے کا رویہ اختیار کرے گی ، امام ابن عقیل حنبلی علیہ الرحمۃ متوفی :(513ھ/1119ء) نے حنابلہ کے معدوم ہونے کی یہی وجہ بتائی ہے۔

شاگردوں و علمائے مسلک کی سستی و کوتاہی:

امام اوزاعی علیہ الرحمۃ کے مسلک کے ساتھ ایک مسئلہ یہ درپیش آیا کہ ان کے تلامذہ کی تعداد بہت محدود تھی، اور انھوں نے مسلک کی حفاظت و ترویج کے سلسلے میں عالی ہمتی کا ثبوت بھی نہیں دیا، ابن عساکر کے مطابق امام موصوف کے فتاوی کا گہرا علم رکھنے والے شاگرد

کل دس تھے، اور ان حضرات نے اُن کے دس فیصد سے بھی کم فتاوی مدون کیے، ان کے شاگردوں نے ان کے فتاوی کی تدوین اور ان کے مذاکرہ پر توجہ نہیں دی، تفریع واستنباط کا تو ذکر کیا؟ اسی لیے ابن عساکر نے نقل کیا ہے کہ امام اوزاعی کے معاصر شامی فقیہ امام سعید بن عبد العزیز تنوخی (متوفی:۱۶۷ / ۷۸۴ء) امام اوزاعی کے شاگردوں کو اس سلسلہ میں تنبیہ کرتے ہوئے کہتے: آخر تم لوگ امام اوزاعی کے فتاوی جمع کیوں نہیں کرتے، ان کا باہم مذاکرہ کیوں نہیں کرتے۔ پھر جب امام اوزاعی علیہ الرحمۃ کا یہ مسلک اندلس پہنچا تو وہاں بھی اسے اپنے لیے یکسو علماد ستیاب نہیں ہو سکے، یعنی ایسے علما میسر نہیں آئے جو اس پر ویسی توجہ دیں جیسی توجہ ایک مسلک کو اپنے بقا اور فروغ کے لیے مطلوب ہوتی ہے، مثلاً قاضی مصعب بن عمران کے سلسلے میں ابن الفرضی نے تاریخ علماء الاندلس میں لکھا ہے کہ: وہ امام اوزاعی اور دیگر شامی علما نیز اہل مدینہ کی آرا نقل کرتے تھے، کسی ایک مسلک کی تقلید نہیں کرتے تھے، اور اپنی صوابدید سے فیصلے کرتے تھے۔ یہی صورت حال امام لیث بن سعد کے مسلک کے ساتھ پیش آئی، جسے امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے الفاظ میں یوں تعبیر کیا ہے: لیث بن سعد علیہ الرحمۃ مالک بن انس سے زیادہ فقیہ تھے، لیکن ان کے شاگردوں نے انھیں ضائع کر دیا۔ بعض مسالک کے ناپید ہونے کا سبب یہ بھی ہوا کہ ان کے متبعین کسی ایک جگہ خاصی تعداد میں جمع نہیں ہو سکے، بلکہ مختلف علاقوں اور شہروں میں پھیل گئے یا بٹ گئے، جس کے نتیجہ میں کوئی ایسا مرکز وجود میں نہیں آسکا جہاں ان مسلک کی اچھی علمی خدمت ہوتی، ان کی تدوین ہوتی، مسلک فروغ پاتا، اور اس ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا جاتا، اور اس طرح وہ مرکز اپنے مسلک کا ایسا قلعہ بنتا جو اس کی حفاظت وترقی کا ضامن ہوتا، اس کی ایک مثال امام ثوری کا مسلک ہے، جن کے شاگرد کوفہ، بغداد، موصل، دینور، ری (آج کا تہران)، خراسان اور مصر میں پھیل گئے تھے۔

عصری اہمیت وعصری اطلاقات

اسلامی فقہی مسالک کے مطالعہ میں معدوم مسالک کی عصری اہمیت اور اطلاقات پر غور کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اگرچہ یہ مسالک تاریخی طور پر ناپید ہو چکے ہیں، ان کے اصول وضوابط اور فقہی اجتہادات آج بھی معاصر اسلامی فقہ اور عملی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔

عصری اہمیت

تاریخی ورثہ اور علمی بنیادیں:

معدوم فقہی مسالک، جیسے امام اوزاعی، امام سفیان ثوری، امام لیث بن سعد، امام ابو ثور، ظاہریہ، اور امام طبری کے مسالک، اسلامی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ان کے اصول اور قوانین آج بھی اسلامی فقہ کی بنیادوں میں شامل ہیں۔ ان مسالک کا مطالعہ ہمیں اسلامی قانونی تاریخ کی گہری تفہیم فراہم کرتا ہے اور معاصر مسائل کے حل کے لیے ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اجتہادی اصول

ان معدوم مسالک کے اجتہادی اصول آج بھی جدید اجتہادات میں استعمال ہوتے ہیں۔ امام اوزاعی اور امام سفیان ثوری جیسے فقہاء کے اجتہادی اصولوں کا مطالعہ جدید مسائل کے حل کے لیے اجتہاد کے عمل میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ان کے اصول و ضوابط سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ کیسے نئے مسائل کا حل پرانے اصولوں کی روشنی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

تنوع اور وسعت

ان معدوم مسالک کا مطالعہ ہمیں اسلامی فقہ کے تنوع اور وسعت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کیسے مختلف ادوار میں مختلف مسائل کا حل مختلف طریقوں سے پیش کیا گیا اور کیسے ان کے اصولوں کو آج کے مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

عصری اطلاقات

جدید قانونی نظام

معدوم مسالک کے اصولوں اور ضوابط کا اطلاق جدید قانونی نظام میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اصول و ضوابط کو مد نظر رکھتے ہوئے جدید مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، امام اوزاعی اور امام لیث بن سعد کے اجتہادی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جدید مالیاتی معاملات اور تجارتی اصولوں کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

تعلیمی نصاب

معدوم مسالک کی تعلیم جدید تعلیمی نصاب میں شامل کی جا سکتی ہے۔ ان کے اصول و ضوابط اور اجتہادات کا مطالعہ طلبہ کو اسلامی فقہ کی تاریخ اور اس کی گہرائی کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ اس سے طلبہ کو اجتہادی اصولوں کی تفہیم حاصل ہوتی ہے اور وہ جدید مسائل کے حل کے لیے اجتہادی عمل میں حصہ لے سکتے ہیں۔

بین المسالک مذاکرات

ان معدوم مسالک کا مطالعہ بین المسالک مذاکرات اور اختلافات کے حل میں بھی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ان کے اصول و ضوابط کا مطالعہ مختلف مسالک کے مابین ہم آہنگی اور مفاہمت کے عمل کو فروغ دے سکتا ہے۔ ان کے اجتہادی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف مسالک کے درمیان اختلافات کو حل کیا جا سکتا ہے۔

معاشرتی انصاف

معدوم مسالک کے اصول و ضوابط کا اطلاق معاشرتی انصاف کے مسائل میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے معاشرتی مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے اور انصاف کی فراہمی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ ان کے اجتہادی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف معاشرتی مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ معدوم فقہی مسالک کے اصول وضوابط اور اجتہادات آج بھی معاصر اسلامی فقہ اور عملی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے اصولوں کا مطالعہ اور اطلاق ہمیں جدید مسائل کے حل کے لیے ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ان معدوم مسالک کی تعلیم اور ان کے اصولوں کا اطلاق ہمیں اجتہادی عمل میں مددگار ثابت ہوتا ہے اور معاصر مسائل کے حل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔